جاناں جاناں

احمد فراز



جاناں جاناں

(شاعری)

احمد فراز

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں
میں سب تری نذر کر رہا ہوں
یہ ان زمانوں کی ساعتیں ہیں

جو زندگی کے نئے سفر میں
تجھے کسی وقت یاد آئیں
تو ایک اک حرف جی اٹھے گا
پہن کے انفاس کے قبائیں
اداس تنہائیوں کے لمحوں
میں ناچ اٹھیں گی یہ اپسرائیں

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دکھ تھے یہ مانتا ہوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی!
تلاش میں تھے یہ جانتا ہوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہوں

مگر ہر اک بار تجھ کو چھو کر
یہ ریت رنگ حنا بنی ہے
یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
یہ آہ سوزاں گھٹا بنی ہے
یہ درد موج صبا ہوا ہے
یہ آگ دل کی صدا بنی ہے

اور اب یہ ساری متاع ہستی
یہ پھول یہ زخم سب ترے ہیں
یہ دکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں
جو تیری قربت تری جدائی
میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

وہ تیرا شاعر ترا مغنی
وہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں
وہ جس کے انداز خسروانہ تھے
اور ادائیں غریب سی تھیں
وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی
خود اس کے اپنے نصیب سی تھیں

نہ پوچھ اس کا کہ وہ دیوانہ
بہت دنوں کا اجڑ چکا ہے
وہ کوہکن تو نہیں تھا لیکن

کڑی چٹانوں سے لڑ چکا ہے □
وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ
اسی کے سینے میں گڑ چکا ہے

◆◆◆

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

زندگی تیری عطا تھی سو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

اول اول کی محبت کے نشے یاد تو کر
بے پیئے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
رگِ مینا سلگ اٹھی کہ رگِ جاں جاناں

مدتوں سے یہی عالم نہ توقع نہ امید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

ہم بھی کیا سادہ تھے ھم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غم دوراں سے جدا ہے غم جاناں جاناں

اب کے کچھ ایسی سجی محفل یاراں جاناں
سر بہ زانو تو ہے کوئی سرگریباں جاناں

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اٹھتا ہی
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں

جس کو دیکھو وہی زنجیر بپا لگتا ہے
شہر کا شہر ہوا داخل زنداں جاناں

اب ترا ذکر بھی شائد ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہوئے درد کے غنواں جاناں

ھم کہ روٹھی ہوئی رت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسم ہجراں جاناں

ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اڑتے ہوئے اوراق پریشاں جاناں

◆◆◆

اے خدا جو بھی مجھے پندِ شکیبائی دے

اے خدا جو بھی مجھے پندِ شکیبائی دے
اس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے

تیرے لوگوں سے گلہ ہے مرے آئینوں کو
ان کو پتھر نہیں دیتا ہے تو بینائی دے

جس کے ایماپہ کیا ترکِ تعلق سب سے
اب وہی شخص مجھے طعنۂ تنہائی دے

یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے چہرے پر
یا مرے زخم کو بھر یا مجھے گویائی دے

اتنا بے صرفہ نہ جائے مرے گھر کا جلنا
چشمِ گریاں نہ سہی چشمِ تماشائی دے

جن کو پیراہنِ توقیر و شرف بخشا ہے
وہ برہنہ ہیں انہیں خلعتِ رسوائی دے

کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے فراز
وہ تو قاتل کو بھی الزامِ مسیحائی دے

◆◆◆

اب کے رت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون

اب کے رت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون
زخم پھولوں کی طرح مہکیں گے پر دیکھے گا کون

دیکھنا سب رقص بسمل میں مگن ہو جائیں گے
جس طرف سے تیر آئے گا ادھر دیکھے گا کون

زخم جتنے بھی تھے سب منسوب قاتل سے ہوئے
تیرے ہاتھوں کے نشاں اے چارہ گر دیکھے گا کون

وہ ہوس ہو یا وفا ہو بات محرومی کی ہے
لوگ تو پھل پھول دیکھیں گے شجر دیکھے گا کون

میری آوازوں کے سائے میرے بام و در پہ ہیں
میرے لفظوں میں اتر کر میرا گھر دیکھے گا کون

ہم چراغ شب ہی جب ٹھہرے تو پھر کیا سوچنا
رات تھی کس کا مقدر اور سحر دیکھے گا کون

آ فصیل شہر سے دیکھیں غنیم شہر کو
شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر دیکھے گا کون

ہر کوئی اپنی ہوا میں مست پھرتا ہے فراز
شہر ناپرساں میں تیری چشم تر دیکھے گا کون

خواب مرتے نہیں

خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہوئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مرجائیں گے
خواب مرتے نہیں
خواب تو روشنی ہیں نوا ہیں' ہوائیں
جو کالے پہاڑوں سے رکتے نہیں
ظلم کے دوزخوں سے بھی پھکتے نہیں
روشنی اور نوا اور ہوا کے علم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں
خواب تو حرف ہیں
خواب تو نور ہیں
خواب سقراط ہیں
خواب منصور ہیں

◆◆◆

ہر خواب عذاب ہو چکا ہے

ہر خواب عذاب ہو چکا ہے
اور تو بھی تو خواب ہو چکا ہے

اب تختۂ ریگ ہے یہ چہرہ
دریا تھا سراب ہو چکا ہے

اب تو ترکِ وفا کا وقت آیا
تو میرا جواب ہو چکا ہے

اب اور کوئی علاج غم کا
اب زہر شراب ہو چکا ہے

اس رت میں بھی بے نمو ہوں جس میں
کانٹا بھی گلاب ہو چکا ہے

◆◆◆

یوں تو پہلے بھی ہوئے اس سے کئی بار جدا

یوں تو پہلے بھی ہوئے اس سے کئی بار جدا
لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جدا

گر غم سود و زیاں ہے تو ٹھہر جا اے جاں
کہ اسی موڑ پہ یاروں سے ہوئے یار جدا

دو گھڑی اس سے رہو دور تو یوں لگتا ہے
جس طرح سایہ سے دیوار جدا

یہ جدائی کی گھڑی ہے کہ جھڑی ساون کی
میں جدا گریہ کناں ابر جدا یار جدا

کجکلا ہوں سے کہے کون کہ اے بے خبرو
طوق گردن سے نہیں طرہ دستار جدا

اس قدر روپ ہیں یاروں کے خوف آتا ہے
سر میخانہ جدا اور سر دربار جدا

کوئے جاناں میں بھی خاصا تھا طرحدار فراز
لیکن اس شخص کی سج دھج تھی سردار جدا

جو رنجشیں تھیں جو دل میں

جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا
کہ اب کی بار گلے مل کے بھی گلہ نہ گیا

اب اس کے وعدہ فردا کو بھی ترستے ہیں
کل اس کی بات پہ کیوں اعتبار آ نہ گیا

اب اس کے ہجر میں روئیں نہ وصل میں خوش ہوں
وہ دوست ہو بھی تو سمجھو کہ دوستانہ گیا

نگاہ یار کا کیا ہے ہوئی ہوئی نہ ہوئی
یہ دل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فراز تھا ظالم سے چپ رہا نہ گیا

◆◆◆

جو بھی درونِ دل ہے

جو بھی درونِ دل ہے وہ باھر نہ آئے گا
اب آ گہی کا زھر زباں پر نہ آئے گا

اب کے بچھڑ کے اس کو ندامت تھی اس قدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا

یوں پھر رہا ہے کانچ کا پیکر لئے ہوئے
غافل کو یہ گماں ہے کہ پتھر نہ آئے گا

پھر بو رہا ہوں آج انہیں ساحلوں پہ پھول
پھر جیسے موج میں یہ سمندر نہ آئے گا

میں جاں بلب ہوں ترکِ تعلق کے زھر سے
وہ مطمئن کہ حرف تو اس پر نہ آئے گا

◆◆◆

□

مت سوچو!

اور اس نے

مرے ساغر میں

مے سرخ انڈیلی۔۔۔۔تو کہا

مت سوچو!

تم یہاں آئے ہو

اس ملک کے

اس شہر کے

اس حجلۂ تسکیں میں جہاں

سب کے سب رقص کناں

نغمہ بلب

مست ادا مت سوچو

جاگتی رات

کے چہرے پہ ہے خوشبو کی ردا

مت سوچو

تم بھی کیا لوگ ہو

پردیس بھی آتے ہو

تو لے آتے ہو

بیمار شب و روز و دل افگار

عزیزان وطن کی یادیں

اپنی ژولیدہ و بوسیدہ قمیصوں کی طرح

جن کے دھبوں کو تو

خود کا مشینیں بھی نہیں دھو سکتیں ☐

یہ جو زنگار ہیں غربت کے

خود آزار جو تاریکیاں ذہنوں کی ہیں

آلائشیں جسموں کی ہیں

اس طرح سنبھالے ہوئے پھرتے ہو

کہ جیسے یہ تمہارے دل و جاں ہوں

اس گھڑی تم ہو جہاں

مملکت خواب نہیں

یاں کسی سوچ کا گرداب نہیں

زندگی مے کی طرح

شوخ ہے طرار ہے

زہراب نہیں

اپنے کشکول کو دہلیز پر رکھ آؤ

کہ دریوزہ گری

اس جگہ شامل آداب نہیں

مت سوچو!

◆◆◆

سنا تو ہے کہ نگار بہار راہ میں ہے

سنا تو ہے کہ نگار بہار راہ میں ہے
سفر بخیر کہ دشمن ہزار راہ میں ہے

گزر بھی جا غم جان و غم جہاں سے کہ یۂ
وہ منزلیں ہیں کہ جن کا شمار راہ میں ہے

تمیز رہبرو رہزن ابھی انہیں ممکن
ذرا ٹھہر کہ بلا کا غبار راہ میں ہے

گروہ کجکلہاں کو کوئی خبر تو کرے
ابھی ہجوم سر رازگزار راہ میں ہے

نہ جانے کب کا پہنچ بھی چکا سر منزل
وہ شخص جس کا ہمیں انتظار راہ میں ہے

فراز اگرچہ کڑی ہے زمین آتش کی
ہزارھا شجر سایہ دار راہ میں ہے

سب لوگ لئے سنگ ملامت نکل آئے

سب لوگ لئے سنگ ملامت نکل آئے
کس شہر میں ہم اہل محبت نکل آئے

اب دل کی تمنا ہے تو اے کاش یہی ہو
آنسوؤں کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے

ہر گھر کا دیا گل نہ کرو تم کہ نجانے
کس بام سے خورشید قیامت نکل آئے

جو درپئے پندار ہیں ان قتل گہوں سے
جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے

اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہد ستم کی
اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
شاید کہ تمہارا قدو قامت نکل آئے

◆◆◆

اب کس کا جشن مناتے ہو

اب کس کا جشن مناتے ہو
اب کس کا جشن مناتے ہو
اس دیس کا جو تقسیم ہوا
اب کس کا گیت سناتے ہو

اس خواب کا جو ریزہ ریزہ
ان آنکھوں کی تقدیر ہوا
اس نام کا جو ٹکڑے ٹکڑے
گلیوں میں بے توقیر ہوا

اس پرچم کا جس کی حرمت
بازاروں میں نیلام ہوئی
اس مٹی کا جس کی حرمت
منسوب عدو کے نام ہوئی

اس جنگ کا جو تم ہار چکے
اس رسم کا جو جاری بھی نہیں
اس زخم کا جو سینے پہ نہ تھا
اس جان کا جو واری بھی نہیں

اس خون کا جو بد قسمت تھا

راہوں میں بہایا تن میں رہا
اس پھول کا جو بے قیمت تھا
آنگن میں کھلایا بن میں رہا

اس مشرق کا جس کا تم نے
نیزے کی انی مرہم سمجھا
اس مغرب کا جس کو تم نے
جتنا بھی لوٹا کم سمجھا
ان معصوموں کا جن کے لہو
سے تم نے فروزاں راتیں کیں
یاں ان مظلوموں کا جن سے
خنجر کی زباں میں باتیں کیں

اس مریم کا جس کی عفت
لٹتی ہے بھرے بازاروں میں
اس عیسیٰ کا جو قاتل ہے
اور شامل ہے غم خواروں میں

ان نوحہ گروں کا جن نے ہمیں
خود قتل کیا خود روتے ہیں
ایسے بھی کہیں دم ساز ہوئے
ایسے جلاد بھی ہوتے ہیں
ان بھوکے ننگے ڈھانچوں کا
جو رقص سر بازار کریں

یا ان ظالم قزاقوں کا ◧
جو بھیس بدل کر وار کریں

یا ان جھوٹے اقراروں کا
جو آج تلک ایفا نہ ہوئے
یا ان بے بس لاچاروں کا
جو اور بھی دکھ کا نشانہ ہوئے

اس شاہی کا جو دست بدست
آئی ہے تمہارے حصے میں
کیوں ننگ وطن کی بات کرو
کیا رکھا ہے اس قصے میں
آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو
ہونٹوں پہ وفا کے بول لئے
اس جشن میں بھی شامل ہوں
نوحوں سے بھرا کشکول لئے

ابر بہار اب کے بھی

ابر بہار اب کے بھی برسا پرے پرے
گلشن اجاڑ اجاڑ ہیں جنگل ہرے ہرے

جانے یہ تشنگی ہے ہوس ہے کہ خود کشی
جلتے ہیں شام ہی سے جو ساغر بھرے بھرے

ہے دل کی موت عہد وفا کی شکستگی
پھر بھی جو کوئی ترک محبت کرے کرے

اب اپنا دل بھی شہر خموشاں سے کم نہیں
سن ہو گئے ہیں کان صدا پر دھرے دھرے

رہتے ہیں اہل شہر کے سائے سے دور دور
ہم آہو ان دشت کی صورت ڈرے ڈرے

گل بن کے پھوٹتا ہے لہو شاخسار سے
زخم رگ بہار ہیں پتے ہرے ہرے

زندہ دلان شہر کو کیا ہوگیا فراز
آنکھیں بجھی بجھی ہیں تو چہرے مرے مرے

◆◆◆

شگفتہ دل ہیں کہ غم

شگفتہ دل ہیں کہ غم بھی عطا بہار کی ہے
گل حباب ہیں سر میں ہوا بہار کی ہے

ہجوم جلوہ گل پر نظر نہ رکھ کہ یہاں
جراحتوں کے چمن پر روا بہار کی ہے

کوئی تو لالہ خونیں کفن سے بھی پوچھے
یہ فصل چاک جگر کی ہے یا بہار کی ہے

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

شمار زخم ابھی سے فراز کیا کرنا
ابھی تو جان مری ابتدا بہار کی ہے

◆◆◆

دل گرفتہ ہی سہی

دل گرفتہ ہی سہی بزم سجالی جائے
یاد جاناں سے کوئی شام نہ خالی جائے

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

مصحف رخ ہے کسی کا کہ بیاض حافظ
ایسے چہرے سے کبھی فال نکالی جائے

وہ مروت سے ملا ہے تو جھکا دوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

بے نوا شہر کا سایہ ہے مرے دل پہ فراز
کس طرح سے مری آشفتہ خیالی جائے

◆◆◆

ستم کا آشنا تھا وہ

ستم کا آشنا تھا وہ سبھی کے دل دکھا گیا
کہ شام غم تو کاٹ لی سحر ہوئی چلا گیا

ہوائے ظلم سوچتی ہے کس بھنور میں آ گئی
وہ اک دیا بجھا تو سینکڑوں دیئے جلا گیا

سکوت میں بھی اس کے اک ادائے نواز بھی
وہ یار کم سخن کئی حکایتیں سنا گیا

اب اک ہجوم عاشقاں ہے ہر طرف رواں دواں
وہ ایک رہ نورد و خود کو قافلہ بنا گیا

دلوں سے وہ گزر گیا شعاع مہر کی طرح
گھنے اداس جنگلوں میں راستہ بنا گیا

کبھی کبھی تو یوں ہوا ہے اس ریاض دہر میں
کہ ایک پھول گلستاں کی آبرو بچا گیا

شریک بزم دل بھی ہیں چراغ بھی ہیں، پھول بھی،
مگر جو جان انجمن تھا وہ کہاں چلا گیا

اٹھو ستم زدہ چلیں یہ دکھ کڑا سہی مگر □
وہ خوش نصیب ہے یہ زخم جس کو راس آگیا

کہ آنسوؤں کے ہار خوں بہا نہیں ہیں دوستو
کہ وہ تو جان دے کے قرض دوستاں چکا گیا

اے مرے یار قدح ریز!

چاند نکلا ہے مری آنکھ
مرے دل میں اتارے ہے تجھے
آمرے یار قدح ریز
مرا جام پکارے ہے تجھے

یونہی تنہائی میں بیٹھا تھا
سر شام بھلا ہوئے ساری دنیا
یونہی اک یاد سی جاگ اٹھی
تو لگنے لگی پیاری دنیا
میں تو جیسا بھی ہوں خوش وقت ہوں
کیسی ہے تمہاری دنیا
تم نے جس داؤں جیتا ہے
اسی بازی میں ہاری دنیا

آمرے یار قدح ریز
مرا جام ہے خالی کب سے
مرا دل چور ہے زخموں سے
میری آنکھ سوالی کب سے
پیش منظر میں اب آ جاؤ
کہ ہیں اصنام خیالی کب سے
منتظر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرح

یوں بجاتے رہیں تالی کب سے ◧
آ مرے یار قدح ریز
مرا نام ہے گالی کب سے

◆◆◆

کہا تھا کس نے کہ عہد وفا کرداس سے

کہا تھا کس نے کہ عہد وفا کر داس سے
جو یوں کیا ہے تو پھر کیوں گلہ کرو اس سے

نصیب پھر کوئی تقریب قرب ہوا کہ نہ ہو
جو دل میں ہوں وہی باتیں کہا کرو اس سے

یہ اھل بزم تنک حوصلہ سہی پھر بھی
ذرا فسانہ دل ابتدا کرو اسے

یہ کیا کہ تم ہی غم ہجر کے فسانے کہو
کبھی تو اس کے بہانے سنا کرو اس سے

فراز ترک تعلق تو خیر کیا ہوگا
یہی بہت ہے ، کہ کم کم ملا کرو اس سے

تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہو گئے

تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہو گئے
پھر جو بھی در ملا ہے اسی در کے ہو گئے

پھر یوں ہوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہو گئے

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے محو نام بھی اکثر کے ہو گئے

اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ ہجر ہم بھی تو پتھر کے ہو گئے

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفتہ رفتہ خود اسی کافر کے ہو گئے

اب کے نہ انتظار کریں چارہ گر کہ ہم
اب کے گئے تو کوئے ستم گر کے ہو گئے

روتے ہو اک جزیرۂ جاں کو فراز تم
دیکھو تو کتنے شہر سمندر کے ہو گئے

◆◆◆

ہر تماشائی فقط ساحل سے

ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا
کون دریا کو الٹتا' کون گوہر دیکھتا

وہ تو دنیا کو مری دیوانگی خوش آگئی
تیرے ہاتھوں میں وگر نہ پہلا پتھر دیکھتا

آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر صدا تجھ کو نہ دی
اس توقع پر کہ شاید تو پلٹ کر دیکھتا

میری قسمت کی لکیریں میرے ہاتھوں میں نہ تھیں
تیرے ماتھے پر کوئی میرا مقدر دیکھتا

زندگی پھیلی ہوئی تھی شام ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چہروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

تو بھی دل کو اک لہو کی بوند سمجھا ہے فراز
آنکھ اگر ہوتی تو قطرے میں سمندر دیکھتا

سحر کے سورج

سحر کے سورج
میں رو رہا ہوں
کہ میرا مشرق لہولہو ہے
وہ میرا مشرق ہی
جو میرا بازو ہے
میرا دل ہے
میری نمو ہے
جو میری اطراف کا نشاں
میری آبرو ہے
لہولہو ہے
سحر کے سورج
میں نصف تاریک
نصف روشن ہوں
کیا ہوا ہے
تجھے گہن لگ گیا
کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے
تیری شعاؤں کا نور اندھیروں میں
گھٹ گیا ہے
کہ آج ہر رشتہ رفاقت بھی کٹ گیا ہے
سحر کے سورج
میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں

میں آپ ہی آج اپنی تحقیر ہو گیا ہوں
میں اسم تصغیر ہو گیا ہوں
میں اپنا آدھا بدن لئے کس طرف کو جاؤں
کسے دکھاؤں
یہ شیشہ جاں کی کرچیاں
اپنے خواب ریزے کہاں چھپاؤں
میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں
سحر کے سورج
ستم کی آندھی رکے
تو میں یہ اجاڑ آنکھیں جھپک سکوں گا
لہو کی بارش تھمے
تو میں اس دکھی بدن کو تھپک سکوں گا
ابھی تو میں جانکنی کے دہرے عذاب میں ہوں
جو بجھ چکے وہ چراغ دیکھوں
کہ اپنے ماتھے کا داغ دیکھوں

سحر کے سورج
مری نظر میں تو ان رفیقوں کے قافلے ہیں
جو گھر سے نکلے تھے سر اٹھائے
قدم جمائے
جو منتظر تھے
کہ رزم گاہ طلب بلائے
جو آزمائش کی ہر گھڑی میں
یقین کی مشعلیں جلائے

وطن کے ناموس کے لئے

بے شمار بازو علم اٹھائے

چلے تھے گھر سے

یہ عہد کر کے

کہ ان کی جانیں رہیں کہ جائیں

مگر وفا پہ نہ حرف آئے

سحر کے سورج

مری نظر میں انہیں رفیقوں کے قافلے ہیں

کہ جن کا پندار ریزہ ریزہ

کہ جن کے ماتھے عرق وعرق ہین

جو یہ پابہ زنجیر

منفعل گردنیں جھکائے

عدو کے نرغے میں

ان اندھیروں کی سرزمین کی طرف رواں ہیں

جہاں حقارت کے طعن

نفرت کے سنگ

رسوائیوں کے بازار

منتظر ہیں

وہاں جہاں سومنات کے پتھروں سے

کتنے ہی میرے محمود غزنوی سنگسار ہوں گے

وہاں

جہاں میری ساری تاریخ کے ورق شرمسار ہوں گے

سحر کے سورج

یہ میں نہ دیکھوں
یہ تو نہ دیکھے
یہ غازیوں کی نظر نہ دیکھے
یہ جانثاروں شہید یاروں کا
چھپاتا لہو نہ دیکھے
یہ میں نہ دیکھوں
یہ تو نہ دیکھے

وہ تو سب درد کے لمحے تھے

وہ تو اک خواب پریشاں تھا جو میں نے دیکھا
وہ تو سب درد کے لمحے تھے
جو مجھ پہ گزرے
میرے ویران مہ و سال
مرے شام و سحر
میری مجروح محبت' مری درماں طلبی
سردہلیزِ رقیباں
مری دریوزہ گری
آنکھ میں اشکِ ندامت کے
تو چہرے پہ فشارِ دل و جاں
میرا ماضی بھی اندھیرا
مرا فردا بھی دھواں
میں کہاں ڈھونڈتا
کھوئی ہستی کے نشاں
تو یہاں تھا نہ وہاں
میں یہاں تھا نہ وہاں
وہ تو سب درد کے لمحے تھے
جو مجھ پر گزرے
پھر یہ کیوں ہے
کہ میرا جسم مرا خوں
نہ ہوا خاکستر

کون اس درد کے دوزخ میں
مہ و سال تلک جل کے بھی
استادہ رہا
زندہ رہنے پر مصر
اور نئی زیست کا دلدادہ رہا
نئی سج دھج سے بسر کرنے پر آمادہ رہا
بس اسی درد کے دوزخ کا رہا ہوں ایندھن
اب جو ابھرا ہوں تو اس آگ سے کندن ہو کر
میں نے اس حسن کو پایا ہے بہت کچھ کھو کر
اپنے بکھرے ہوئے پندار
کا ریزہ ریزہ
چن رہا ہوں شب صحرا سے ستاروں کی طرح
اپنے ملبوس دریدہ کے پریشاں ٹکڑے
جنبش سوزن امید کی خیاطی سے
سی رہا ہوں کہ مرا اسم برہنہ نہ رہے
مجھ پر قرض غم جان و غم دینا نہ رہے
وہ تو سب درد کے لمحے تھے جو مجھ پر گزرے
کس شعلہ بے باک کس پرچم پراں کی طرح
کرہ خاک میں لہرانے لگا ہوں پھر سے
اے مرے لمحہ آئندہ مرے شوق کے فردا
تیری منزل کی طرف آنے لگا ہوں پھر سے
اپنے خاشاک کو
انگار سے چمکانے لگا ہوں پھر سے

◆◆◆

سوئے فلک نہ جانب مہتاب

سوئے فلک نہ جانب مہتاب دیکھنا
اس شہر دلنواز کے آداب دیکھنا

تجھ کو کہاں چھپائیں کہ دل پر گرفت ہو
آنکھوں کو کیا کریں کہ وہی خواب دیکھنا

وہ موج خوں اٹھی ہے کہ دیوار و در کہاں
اب کے فصیل شہر کو غرقاب دیکھنا

ان صورتوں کو ترسے گی چشم جہاں کہ آج
کم یاب ہیں تو کل ہمیں نایاب دیکھنا

پھر خون خلق و گردن مینا بچائیو
پھر چل پڑا ہے ذکر مے ناب دیکھنا

آباد کوئے چاک گریباں جو پھر ہوا
دست رقیب و دامن احباب دیکھنا

ہم لے تو آئے ہیں تجھے اک بیدلی کے ساتھ
اس انجمن میں اے دل بیتاب دیکھنا

حد چاہیے فراز وفا میں بھی اور تمہیں
غم دیکھنے نہ دل کی تب و تاب دیکھنا

ستم گری کا ہر انداز

ستم گری کا ہر انداز محرمانہ لگا
میں کیا کروں مرا دشمن مجھے برا نہ لگا

ہر اک کو زعم تھا کس کس کو نا خدا کہتے
بھلا ہوا کہ سفینہ کنارے جا نہ لگا

مرے سخن کا قرینہ ڈبو گیا مجھ کو
کہ جس کو حال سنایا اسے فسانہ لگا

برون در نہ کوئی روشنی نہ سایہ تھا
سبھی فساد مجھے اندرون خانہ لگا

میں تھک گیا تھا بہت پے بہ پے اڑانوں سے
جبھی تو دام بھی اس بار آشیانہ لگا

اس عہد ظلم میں میں بھی شریک ہوں جیسے
مرا سکوت مجھے سخت مجرمانہ لگا

وہ لاکھ زور فراموش ہو فراز مگر
اسے بھی مجھ کو بھلانے میں ایک زمانہ لگا

◆◆◆

جو سزا ہم کو ملے.......

اور ہمیں درد کی منزل پہ پہنچنے والے
کہہ رہے ہیں کہ اسے اور بھی آسان کرو
تاکہ ہم اپنے پرائے کو بھی پہچان سکیں
اور کچھ دوست اسی راہ میں قربان کرو

شام آئی ہے ہمیشہ یہی لالی لے کر
جو کبھی خون تمنا کبھی گلزار لگے
اتنی آشفتہ نہ تھی خواہش یاراں پہلے
اب تو ہر جذبہ آسودہ بھی تلوار لگے

تو کہ تنہا ہے مری طرح تو مجبور نہ بن
کارواں اتریں گے اس کوہ ندا سے کتنے
شمعیں بجھ جائیں گی اور خورشید ابھر آئیں گے
اور اسی ساحل امید سے پیاسے کتنے

یوں پکاریں گے کہ یہ بوند سمندر کر دے
آج مصلوب جو ہو اس کو پیمبر کر دے
یہ جو ہونا ہے تو ہم یونہی گنہگار رہیں
جو سزا ہم کو ملے اس کی سزا وار ہیں

◆◆◆

آزردگان شہر کا جیسا

آزادگان شہر کا جیسا بھی حال ہو
اے یار خوش دیار تجھے کیوں ملال ہو

اب بات دوستی کی نہیں حوصلے کی ہے
لازم نہیں کہ تو بھی میرا ہم خیال ہو

اب کے وہ درد دے کہ میں روؤں تمام عمر
اب کے لگا وہ زخم کہ جینا محال ہو

پہلے وہ اضطراب تجھے کس طرح بھلائیں
اب یہ عذاب کیسے طبعیت بحال ہو

خود میرا ہاتھ مری بربادیوں میں تھا
تیری جبیں پہ کیوں عرق انفعال ہو

پھر تو نے چھیڑ دی ہے کئی ساعتوں کی بات
وہ گفتگو نہ کر کہ تجھے بھی ملال ہو

میری ضرورتوں سے زیادہ کرم نہ کر
ایسا سلوک کر کہ مرے حسب حال ہو

ٹوٹا تو ہوں مگر ابھی بکھرا نہیں فراز
میرے بدن پہ جیسے شکستوں کا جال ہو

تری یادوں کا وہ عالم

تری یادوں کا وہ عالم نہیں ہے
مگر دل کی اداسی کم نہیں ہے

ہمیں بھی یاد ہے مرگ تمنا
مگر اب فرصت ماتم نہیں ہے

ہوائے قرب منزل کا برا ہو
فراق ہمسفر کا غم نہیں ہے

جنوں پار سائی بھی تو ناصح
مری دیوانگی سے کم نہیں ہے

یہ کیا گلشن ہے جس گلشن میں لوگو
بہاروں کا کوئی موسم نہیں ہے

قیامت ہے کہ ہر مے خوار پیاسا
مگر کوئی حریف جم نہیں ہے

صلیبوں پر کھنچے جاتے ہیں لیکن
کسی کے ہاتھ میں پرچم نہیں ہے

فراز اس قحط زار روشنی میں □
چراغوں کا دھواں بھی کم نہیں ہے

◆◆◆

برسوں کے بعد دیکھا اک شخص دلربا سا

برسوں کے بعد دیکھا اک شخص دلربا سا
اب ذہن میں نہیں ہے پر نام تھا بھلا سا

ابرو کھچے کھچے سے آنکھیں جھکی جھکی سی
باتیں رکی رکی سی لہجہ تھکا تھکا سا

الفاظ تھے کہ جگنو آواز کے سفر میں
بن جائے جنگلوں میں جس طرح راستا سا

خوابوں میں خواب اس کے یادوں میں یاد اسکی
نیندوں میں گھل گیا ہو جیسے کہ رتجگا سا

پہلے بھی لوگ آئے کتنے ہی زندگی میں
وہ ہر طرح سے لیکن اوروں سے تھا جدا سا

اگلی محبتوں نے وہ نامرادیاں دیں
تازہ رفاقتوں سے دل تھا ڈرا ڈرا سا

تجھ یہ کہ مدتوں سے ہم بھی نہیں تھے روئے
کچھ زہر میں بجھا تھا احباب کا دلاسا

پھر یوں ہوا کہ ساون آنکھوں میں آ بسے تھے
پھر یوں ہوا کہ جیسے دل بھی تھا آبلہ سا

اب سچ کہیں تو یار و ھم کو خبر نہیں تھی
بن جائے گا قیامت اک واقعہ ذرا سا

تیور تھے بے رخی کے انداز دوستی کے
وہ اجنبی تھا لیکن لگتا تھا آشنا سا

ہم دشت تھے کہ دریا، ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا

ہم نے بھی اس کو دیکھا کل شام اتفاقا
اپنا بھی حال ہے اب لوگو فراز کا سا

جسم کا شعلہ ہے جبھی

جسم کا شعلہ ہے جبھی جامہ سادہ پہنا
میرے سورج نے بھی بادل کا لبادہ پہنا

سلوٹیں ہیں مرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا

خواہشیں یوں ہی برہنہ ہوں تو جل بجھتی ہیں
اپنی چاہت کو کبھی کوئی ارادہ پہنا

یار خوش ہیں کہ انہیں جامہ احرام ملا
لوگ ہنستے ہیں کہ قامت سے زیادہ پہنا

یار پیماں شکن آئے اگر اب کے تو اسے
کوئی زنجیر وفا اے شب وعدہ پہنا

غیرت عشق تو مانع تھی مگر میں نے فراز
دوست کا طوق سر محفل عدا پہنا

◆◆◆

سچ بھی جھوٹا ہے

سچ بھی جھوٹا ہے
کہ اس کے بھی کئی چہرے ہیں
ایک چہرہ کہ ترے قرب کی ساعت میں مجھے
نہ کوئی خواہش آغوش رہی
اور نہ تمنائے وصال
ایک چہرہ کہ
ترے جسم کی حرمت کی قسم کھا کے
پھر اک دیدہ مشکوک کو سمجھاتا رہا
آسمانوں کے صحیفوں سے اتارے ہوئے
الفاظ کو دہراتا رہا
ایک چہرہ
کہ ترے پاس سے اٹھا ہوں
تو خود سوچتا ہوں
کہ امر سرد لہو
گرمی شوق سے اور آتش محرومی سے
کیوں پھکتا ہے
اور بدن
نشے کے عالم میں بھی کیوں دکھتا ہے

◆◆◆

میں نے آغاز سے انجام

میں نے آغاز سے انجام سفر جانا ہے
سب کو دو چار قدم چل کے ٹھہر جانا ہے

غم وہ صحرائے تمنا کہ بگولے کی طرح
جس کو منزل نہ ملی اس کو بکھر جانا ہے

تیری نظروں میں مرے درد کی قیمت کی تھی
میرے دامن نے تو آنسو کو گہر جانا ہے

اب کے بچھڑے تو نہ پہچان سکیں گے چہرے
میری چاہت ترے پندار کو مر جانا ہے

جانے والے کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم پکارو بھی تو کب اس کو ٹھہر جانا ہے

تیز سورج میں چلے آتے ہیں میری جانب
دوستوں نے مجھے صحرا کا شجر جانا ہے

زندگی کو بھی ترے در سے بھکاری کی طرح
ایک پل کے لئے رکنا ہے گزر جانا ہے

اپنی افسردہ مزاجی کا برا ہو کہ فراز ☐
واقعہ کوئی بھی ہو آنکھ کو بھر جاتا ہے

میں کہ پھر دشت رفاقت

میں کہ پھر دشت رفاقت کا سفر کر آیا
کیا کہوں کتنی اذیت سے گزر کر آیا

ہر کوئی ہم سے ملا عمر گریزاں کی طرح
وہ تو جس دل سے بھی گزرا وہیں گھر کر آیا

تم نے اک سنگ اٹھایا مرے آئینے پر
اور ہر شخص کو میں آئینہ گر کر آیا

مجھ سے کیا پوچھتے ہو شہر وفا کیسا ہے
ایسے لگتا ہے صلیبوں سے اتر کر آیا

صرف چہرے ہی اگر کرب کے آئینے میں
کیوں نہ میں دل کا لہو آنکھ میں بھر کر آیا

اب جو اس شہر کی تقدیر ہؤ میں تو لوگو
درو دیوار پہ حسرت کی نظر کر آیا

ہم تو سمجھے تھے محبت کا پیمبر ہے فراز
اور وہ بے مہر بھی توہین ہنر کر آیا

◆◆◆

ہاتھ اٹھائے ہیں مگر

ہاتھ اٹھائے ہیں مگر لب پہ دعا کوئی نہیں
کی عبادت بھی تو وہ جس کی جزا کوئی نہیں

یہ بھی وقت آنا تھا' اب تو گوش بر آواز ہے
اور میرے بربط دل میں صدا کوئی نہیں

آکہ اب تسلیم کر لیں' تو نہیں تو میں سہی
کون مانے گا کہ ہم میں بے وفا کوئی نہیں

وقت نے وہ خاک اڑائی ہے کہ دل کے دشت سے
قافلے گزرے ہیں پھر بھی نقش پا کوئی نہیں

خود کو یوں محصور کر بیٹھا ہوں اپنی ذات میں
منزلیں چاروں طرف ہیں راستہ کوئی نہیں'

کیسے رستوں سے چلے اور کس جگہ پہنچے فراز
یا ہجوم دوستاں تھا ساتھ یا کوئی نہیں

◆◆◆

تو بہتر ہے یہی

یہ تری آنکھوں کی بے زاری یہ لہجے کی تھکن
کتنے اندیشوں کی حامل ہیں یہ دل کی دھڑکنیں
پیشتر اس کے کہ ہم پھر سے مخالف سمت کو
بے خدا حافظ کہے چل دیں جھکا کر گردنیں

آؤ اس دکھ کو پکاریں جس کی شدت نے ہمیں
اس قدر اک دوسرے کے غم سے وابستہ کیا
وہ جو تنہائی کا دکھ تھا تلخ محرومی کا دکھ
جس نے ہم کو درد کے رشتے میں پیوستہ کیا

وہ جو اس غم سے زیادہ جاں گسل قاتل رہا
وہ جو اک سیل بلا انگیز تھا اپنے لئے
جس کے پل پل میں تجھے صدیوں کے سمندر موجزن
چیختی یادیں لئے اجڑے ہوئے سپنے لئے

میں بھی ناکام وفا تھا تو بھی محروم مراد
ہم یہ سمجھے تھے کہ درد مشترک راس آگیا
تیری کھوئی مسکراہٹ قہقہوں میں ڈھل گئی
میرا گم گشتہ سکوں پھر سے مرے پاس آگیا

تپتی دوپہروں میں آسودہ ہے بازو مرے

تیری زلفیں اس طرح بکھریں گھٹائیں ہو گئیں
تیرا برفیلا بدن بے ساختہ لو دے اٹھا
میری سانسیں شام کی بھیگی ہوائیں ہو گئیں

زندگی کی ساعتیں روشن تھیں شمعوں کی طرح
جس طرح سے شام گزرے جگنوؤں کے شہر میں
جس طرح مہتاب کی وادی میں دو سائے رواں
جس طرح گھنگرو چھنک اٹھیں نشے کی لہر میں

آؤ یہ سوچیں بھی قاتل ہیں تو بہتر ہے یہی
پھر سے ہم اپنے پرانے زہر کو امرت کہیں
تو اگر چاہے تو ہم اک دوسرے کو چھوڑ کر
اپنے اپنے بے وفاؤں کے لئے روتے رہیں

یہ جو نشے ہیں سفر کے

یہ جو نشے ہیں سفر کے نہ اتر جائیں کہیں
کوئی منزل نہ سہی سامنے پڑ جائیں کہیں

اس کی محفل نہ سہی ہجر کا صحرا ہی سہی
خواب و خوشبو کی طرح آؤ بکھر جائیں کہیں

تجھ کو یہ دکھ کہ مری چارہ گری کیسے ہو
مجھ کو یہ غم ہے مرے زخم نہ بھر جائیں کہیں

اس خلا میں تو زمیں ٹوٹ کے یاد آئی ہے
کوئی قلزم ہو کہ دلدل ہو اتر جائیں کہیں

گھر سے نکلے تھے کہ دنیا نے پکارا تھا فراز
اب جو فرصت ملے دنیا سے تو گھر جائیں کہیں

آنسو نہ روک دامن زخم جگر نہ کھول

آنسو نہ روک دامن زخم جگر نہ کھول
جیسا بھی حال ہو نگہہ یار پر نہ کھول

جب شہر لٹ گیا تو کیا گھر کو دیکھنا
کل آنکھ نم نہیں تھی تو اب چشم تر نہ کھول

چاروں طرف ہیں دام شنیدن بچھے ہوئے
غفلت میں طاہران معانی کے پر نہ کھول

کچھ تو کڑی کٹھور مسافت کا دھیان کر
کوسوں سفر پڑا ہے ابھی سے کمر نہ کھول

عیسیٰ نہ بن کہ اس کا مقدر صلیب ہے
انجیل آگہی کے ورق عمر بھر نہ کھول

امکاں میں ہے تو بندو سلال پہن کے چل
یہ حوصلہ نہیں ہے تو زنداں کے در نہ کھول

میری یہی بساط کہ فریاد بھی کروں
تو چاہتا نہیں ہے تو باب اثر نہ کھول

تو آئینہ فروش و خریدار کور چشم
اس شہر میں فراز دکان ہنر نہ کھول

◆◆◆

عجب جنوں مسافر میں

عجب جنوں مسافت میں گھر سے نکلا تھا
خبر نہیں ہے کہ سورج کدھر سے نکلا تھا

یہ کون پھر سے انہیں راستوں میں چھوڑ گیا
ابھی ابھی تو عذاب سفر سے نکلا تھا

یہ تیر دل میں مگر بے سبب نہیں اترا
کوئی تو حرف لب چارہ گر سے نکلا تھا

یہ اب جو آگ بنا شہر شہر پھیلا ہے
یہی دھواں مرے دیوار و در سے نکلا تھا

میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا
کہ دل کا زہر مری چشم تر سے نکلا تھا

یہ اب جو سر ہیں خمیدہ کلاہ کی خاطر
یہ عیب بھی تو ہم اہل ہنر سے نکلا تھا

وہ قیس اب جسے مجنوں پکارتے ہیں فراز
تری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا

ترچ میر!

ترچ میر!
میں تیرے قدموں میں
اک بے وقر سنگ ریز کی صورت
تری جاں ربا رفعتوں کی طرف دیکھتا ہوں
تری چوٹیاں
برف کے تاج پہنے
ازل سے اسی تمکنت سے ستادہ ہیں
سورج کی لالی میں ڈوبے ہوئے ابر
ان کا لبادہ ہیں
اور آسمانی ہواؤں کی مانند
مشرق سے مغرب تلک
ان کے دامن کشادہ ہیں
اے آسمانی ہواؤں کے مسکن
تری آنکھ نے
روز وشب کے سپید وسیہ
ان گنت قافلوں کا تماشا کیا ہے
تری بے صدا گھاٹیوں سے
کئی فاتحوں کی جری لشکروں نے گزرتے ہوئے
صاف وشفاف چشموں کا پانی پیا ہے
کنر
وقت کی آبجو کی طرح

تیرے پہلو میں بہتا ہے

اور ان کی تاریخ کہتا ہے

جو اب عدم کا سفر کر چکے ہیں

جو تیرے مکینوں کی مانند

زندہ ہیں

پر مر چکے ہیں

میں ان کی صدا سن رہا ہوں

تو کیا

اپنے مردوں کی پرچھائیاں

صرف غیض وغضب جانتی ہیں

تو کیا قہر ہی

ان کی برحق عدالت کا دستور ہے

صرف ادبار کی بجلیاں

ان کا سارا اثاثہ ہیں

اور اپنی درگاہ کے سائلوں میں

ہمیشہ عذابوں کی خیرات ہی بانٹتے ہیں

قیامت ہے

اے اپنے آبا کی روحوں کے مسکن

کہ وادی کے ہر کھیت پر بانجھ پن کی نحوست ہے

اور مرد و زن ڈھور ڈنگر

سبھی بھوک سے ادھ موئے ہو رہے ہیں

ہمارے سیہ بخت بچے فلاکت کے غاروں میں دبکے ہوئے

تیرے سورج کی ضو کو ترستے ہیں

پالے کی شدت سے ہر اک چراگاہ

صحرا کی مانند سوکھی پڑی ہے
اندھیرے گھنے جنگلوں کے درندوں
کی خونخوار آنکھیں ہمیں حرص سے
دیکھتی ہیں
ترے موسموں اور گھٹاؤں کی بخشش
فقط قحط ہے
قہر ہے
غیض ہے
اے ترچ میر
تو کتنا بے فیض ہے!

طعنہ زن تھا ہر کوئی

طعنہ زن تھا ہر کوئی ہم پر دل ناداں سمیت
ہم نے چھوڑا شہر رسوائی درجاناں سمیت

اس قدر افسردہ خاطر کون محفل سے گیا
ہر کسی کی آنکھ پرنم ہے دل آزاراں سمیت

اک فقیہ شہر کو کیا دوش دیجے جب سبھی
میکدے کے دشمنوں میں ہوں قدح خواراں سمیت

جشن مقتل تھا بپا اور صرف بسمل تھے ہمیں
ہم نے سوچا تھا کہ دیکھیں گے یہ دن یاراں سمیت

یہ رعونت تابکے اے دل فگاراں دیکھنا
اب گرے گا طرہ سلطاں سر سلطاں سمیت

وہ تو کیا آتے شب ہجراں تو کیا کٹتی فراز
بجھ گئیں آخر کو سب شمعیں چراغ جاں سمیت

◆◆◆

میں تو لب کھول کے

میں تو لب کھول کے پابند سلاسل ٹھہرا
تیری بات اور ہے تو صاحب محفل ٹھہرا

کیا کہوں کس نے قبیلہ مرا تقسیم کیا
آج تو یوں ہے کوئی بسمل، کوئی قاتل ٹھہرا

خواب آوارہ کسی آنکھ کی تقدیر تو بن
کسی منزل پہ کبھی قافلہ دل ٹھہرا

مجھ کو بھی تیری اداسی دل ویراں سی لگی
میں بھی اے شہر جدائی ترے قابل ٹھہرا

کیا گلہ تجھ سے کہ آشوب جہاں ایسا ہے
میں بھی اے یار تری یاد سے غافل ٹھہرا

خوشنوایان چمن سب میں اسیران قفس
اب کے زنداں بھی تو گلزار عنادل ٹھہرا

کتنے ہی سخت مقام آئے مگر جان فراز
نہ ترا درد ہی ٹھہرا نہ مرا دل ٹھہرا

اس دو بے جنوں کی کہانی

اس دو بے جنوں کی کہانی کوئی لکھو
جسموں کو برف خون کو پانی کوئی لکھو

کوئی کہو کہ ہاتھ قلم کس طرح ہوئے
کیوں رک گئی قلم کی روانی کوئی لکھو

کیوں اہل شوق سرگریباں ہیں دوستو
کیوں خوں بہ دل ہے عہد جوانی کوئی لکھو

کیوں سرمہ در گلو ہے ہر اک طائر سخن
کیوں گلستاں قفس کا ہے ثانی کوئی لکھو

ہاں تازہ سانحوں کا کرے کون انتظار
ہاں دل کی واردات پرانی کوئی لکھو

◆◆◆

قلم سرخرو ہے

قلم سرخرو ہے
کہ جو اس نے لکھا
وہی آج میں ہوں
وہی آج تو ہے
قلم نے لکھا تھا
کہ جب بھی زبانوں پہ پہرے لگے ہیں
تو بازو سناں تولتے ہیں
کب جب بھی لبوں پر خموشی کے تالے پڑے ہوں
تو زنداں کے دیوار در بولتے ہیں
کہ جب حرف زنجیر ہوتا ہے
شمشیر ہوتا ہے آخر
تو آمر کی تقدیر ہوتا ہے آخر
کہ جو حرف ہے زیست کی آبرو ہے
قلم سرخرو ہے
قلم نے لکھا تھا
یہ دھرتی اسکی ہے جو
ظلم کے موسموں میں
کھلے آسمانوں تلے
اس کی مٹی میں اپنا لہو گھولتا ہے
جو اپنے لہو کی تمازت سے
زلف نمو کی گرہ کھولتا ہے

وہی جس کی پوروں کے مس سے
سکوت زمیں بولتا ہے
مگر جس نے بویا تھا کاٹا تھا
اس کے مقدر میں نان جویں تک نہ تھی
جس کا پیکر مشقت سے پتھرا گیا
اور جس کے لبوں پر نہیں تک نہ تھی
اسی سے عبارت یہ سب رنگ و بو ہے
قلم سرخرو ہے
قلم سرخرو ہے
کہ اس نے لکھا تھا

وہ بازو
جو پتھر سے ہیرے تراشیں
مگر بے نشاں ان کے گھر
بے کفن ان کی لاشیں
وہی کوہکن
جن کے تیشے پہاڑوں کے دل چیر ڈالیں
مگر خسروان جہاں ان کی شیریں چرالیں
وہی جن کے جسموں کے پیوند
اہل ہوس کی قبا میں لگے تھے
وہی سادہ دل
جن کی نظریں فلک پر جمی تھیں
تو لب منعموں کی ثنا میں لگے تھے
اب ان کی ثنا چار سو ہے
قلم سرخرو ہے

◆◆◆

آئے تری محفل میں تو

آئے تری محفل میں تو بے تاب بہت تھے
جو اھل وفا واقف آداب بہت تھے

اس شہر محبت میں عجب کال پڑا ہے
ہم جیسے سبک لوگ بھی نایاب بہت ہے

کچھ دل ہی نہ مانا کہ سبک سرہوں وگرنہ
آسودگی جاں کے تو اسباب بہت تھے

مجبور تھے لے آئے کنارے پہ سفینہ
دریا جو ملے ہم کو وہ پایاب بہت تھے

اب دیکھ یہ حسرت بھری اجڑی ہوئی آنکھیں
دنیا ترے بارے میں مرے خواب بہت تھے

میں کیوں نہ فراز ان کی طرح مہر بلب تھا
اس بات سے ناخوش مری احباب بہت تھے

محبت کا آسرا لے جا

وفا کے خواب محبت کا آسرا لے جا
اگر چلا ہے تو جو کچھ مجھے دیا لے جا

مقام سود و زیاں آگیا ہے پھر جاناں
یہ زخم میرے سہی تیر تو اٹھا لے جا

یہی ہے قسمت صحرا یہی کرم تیرا
کہ بوند عطا کر گھٹا لے جا

غرور دوست سے اتنا بھی دل شکستہ نہ ہو
پھر اس کے سامنے دامان التجا لے جا

ندامتیں ہوں تو سربار دوش ہوتا ہے
فراز جاں کے عوض آبرو بچا لے جا

دوست بھی دشمن نہ تھے

دوست بھی دشمن نہ تھے دل بھی عدو میرا نہ تھا
یہ تو مجھ پر اب کھلا ظالم کہ تو میرا نہ تھا

اس طرح خوش ہو رہا ہوں جشن مقتل دیکھ کر
جس طرح ہر نوک خنجر پر لہو میرا نہ تھا

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا
ورنہ میں تیرا نہیں تھا اور تو میرا نہ تھا

وہ کہیں بھی چھوڑ جاتا کیا گلہ اس سے کہ وہ
اک مسافر تھا شریک جستجو میرا نہ تھا

اب تو خود سے بولتے میں خوف ہے فراز
اتنا دل آزار طرز گفتگو میرا نہ تھا

خٹک ناچ

اک ہاتھ رومال ہے اک ہاتھ میں تلوار
پشتون کا کردار
جو پیار کرے پیار ملے وار کرے وار کرے
ہر بات پہ تیار
کہسار کے سورج کی طرح گرم وشفق رو
خیبر کی ہواؤں کی طرح تند وتنک خو
یہ نغمہ دلدار بھی... شعلہ بیدار
پشتون کا کردار
یہ مرد کہستان جو چٹانوں میں ڈھلا ہے
شاہین صفت آزاد فضاؤں میں پلا ہے
رقصندہ ودرخشندہ وتابندہ طرار
پشتون کا کردار
یہ رقص وفا کا بھی' جنوں کا بھی یہی رقص
جینے کی ادا گردش خوں کا بھی یہی رقص
وہ جنگ کا میدان ہو یا امن کا دربار
پشتون کا کردار
جو پیار کرے پیار ملے وار کرے وار
ہر بات پہ تیار
پشتون کا کردار

جس سمت بھی دیکھوں

جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو
اے جان جہان یہ کوئی تم سا ہے کہ تم ہو

یہ خواب ہے، خوشبو ہے کہ جھونکا ہے کہ پل ہے
یہ دھند ہے بادل ہے کہ سایا ہے کہ تم ہو

اس دید کی ساعت میں کئی رنگ ہیں لرزاں
میں ہوں کہ کوئی اور ہے دنیا ہے کہ تم ہو

دیکھو یہ کسی اور کی آنکھیں ہیں کہ میری
دیکھوں یہ کسی اور کا چہرہ ہے کہ تم ہو

یہ عمر گریزاں کہیں ٹھہری تو یہ جانوں
ہر سانس میں مجھ کو یہی لگتا ہے کہ تم ہو

ہر بزم میں موضوع سخن دل زدگاں کا
اب کون ہے شیریں ہے کہ لیلا ہے کہ تم ہو

اک درد کا پھیلا ہوا صحرا ہے کہ میں ہوں
اک موج میں آیا ہوا دریا ہے کہ تم ہو

وہ وقت نہ آئے کہ دل زار بھی سوچے
اس شہر میں تنہا کوئی ہم سا ہے کہ تم ہو

آباد ہم آشفتہ سروں سے نہیں مقتل
یہ رسم ابھی شہر میں زندہ ہے کہ تم ہو

اے جان فراز اتنی بھی توفیق کسے تھی
ہم کو غم ہستی بھی گوارا ہے کہ تم ہو

نوحہ گروں میں دیدہ تر

نوحہ گروں میں دیدہ تر بھی اسی کا تھا
مجھ پہ ظلم بار دگر بھی اس کا تھا

دیکھا مجھے تو ترک تعلق کے باوجود
وہ مسکرا دیا یہ ہنر بھی اسی کا تھا

آنکھیں کشاد وبست سے بدنام ہوگئیں
سورج اسی کا خواب سحر بھی اسی کا تھا

خنجر در آستیں ملا جب کبھی ملا
وہ تیغ کھینچتا تو یہ سر بھی اسی کا تھا

نشتر چھپے ہوئے تھے رگ جاں کے آس پاس
وہ چارہ گر تھا اور مجھے ڈر بھی اسی کا تھا

محفل میں کل فراز ہی شاید تھا لب کشا
مقتل میں آج کاسہ سر بھی اسی کا تھا

زلف راتوں سی ہے

زلف راتوں سی ہے رنگ ہے اجالوں جیسی
پر طبیعت ہے ' وہی بھولنے والی جیسی

اک زمانے کی رفاقت پہ بھی رم خوردہ ہے
اس کم آمیز کی خوبو ہے غزالوں جیسی

ڈھونڈتا پھرتا ہوں لوگوں میں شباہت اسکی
کہ وہ خوابوں میں بھی لگتی ہے خیالوں جیسی

کس دل آزار مسافت میں لوٹا ہوں کہ ہے
آنسوؤں میں بھی تپک پاؤں کے چھالوں جیسی

اس کی باتیں بھی دل آویز ہیں صورت کی طرح
میری سوچیں بھی پریشاں مرے بالوں جیسی

اس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

عید کارڈ

تجھ سے بچھڑ کر بھی زندہ تھا
مر مر کر یہ زہر پیا ہے
چپ رہنا آسان نہیں تھا
برسوں دل کا خوں کیا ہے
جو کچھ گزری جیسی گزری
تجھ کو کب الزام دیا ہے
اپنے حال پہ خود رویا ہوں
خود ہی اپنا چاک سیا ہے
کتنی جانکاہی سے میں نے
تجھ کو دل سے محو کیا ہے
سناٹے کی جھیل میں تو نے
پھر کیوں پتھر پھینک دیا ہے

نہ دل سے آہ نہ لب سے

نہ دل سے آہ نہ لب سے صدا نکلتی ہے
مگر یہ بات بڑی دور جا نکلتی ہے

ستم تو یہ ہے کہ عہد ستم کے جاتے ہی
تمام خلق مری ہم نوا نکلتی ہے

وصال ہجر کی حسرت میں جوئے کم مایہ
کبھی کبھی کسی صحرا میں جا نکلتی ہے

میں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہنے پر بھی
ترے لئے مرے دل سے دعا نکلتی ہے

وہ زندگی ہو کہ دنیا فراز کیا کیجے
کہ جس سے عشق کرو بے وفا نکلتی ہے

◆◆◆

ہنسے تو آنکھ سے آنسو

ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے

بہت سے زخم ہیں ایسے جو ان کے نام کے ہیں
بہت سے قرض سرودستاں ہمارے ہوئے

کہیں تو آگ لگی ہے وجود کے اندر
کوئی تو دکھ ہے کہ چہرے دھواں ہمارے ہوئے

گرج برس کے نہ ہم کو ڈبو سکے بادل
تو یہ ہوا کہ وہی بادباں ہمارے ہوئے

فراز منزلِ مقصود بھی نہ تھی منزل
کہ ہم کو چھوڑ کے ساتھی رواں ہمارے ہوئے

◆◆◆

کوئی جنوں بھی نہیں

فراز اب کوئی سودا کوئی جنوں بھی نہیں
مگر قرار سے دن کٹ رہے ہوں یوں بھی نہیں

لب و دہن بھی ملا گفتگو کا فن بھی ملا
مگر جو دل پہ گزرتی ہے کہہ سکوں بھی نہیں

نہ جانے کیوں مری آنکھیں برسنے لگتی ہیں
جو سچ کہوں تو کچھ ایسا اداس ہوں بھی نہیں

مری زبان کی لکنت سے بدگماں نہ ہو
جو تو کہے تو تجھے عمر بھر ملوں بھی نہیں

دکھوں کے ڈھیر لگے ہیں کہ لوگ بیٹھے ہیں
اسی دیار کا میں بھی ہوں اور ہوں بھی نہیں

فراز جیسے دیا قربت ہوا چاہے
وہ پاس آئے تو ممکن ہے میں ہوں بھی نہیں

میورکا

(سپین کا ایک خوبصورت جزیرہ)

میورکا کے ساحلوں پہ کس قدر گلاب تھے
کہ خوشبوئیں تھی بے طرح کہ رنگ لے حساب تھے

تنگ لباسیاں شناوروں کی تھیں قیامتیں
تمام سیم تن شریک جشن شہر آب تھے

شعاع مہر کی ضیا سے تھے جگر جگر بدن
قمر جمال جن کے عکس روشنی کے باب تھے

کھلی فضا کی دھوپ وہ کہ جسم سانولے کرے
بتان آزادی کہ مست غسل آفتاب تھے

یہیں پتہ چلا کہ زیست حسن ہے بہار ہے
یہیں خبر ہوئی کہ زندگی کے دکھ سراب تھے

یہیں لگا کہ گردشوں کے زاویے بدل گئے
نہ روز و شب کی تلخیاں نہ وقت کے عذاب تھے

مرے تمام دوست اجنبی رفاقتوں میں گم
مری نظر میں تیرے خدو خال تیرے خواب تھے

میں دوریوں کے باوجود تیرے آس پاس تھا
میور کے ساحلوں پہ میں بہت اداس تھا

◆◆◆

تھی مرے جام میں دردِ مے تنہائی بہت

تھی مرے جام میں درد مے تنہائی بہت
کل کسی یار قدح ریز کی یاد آئی بہت

نہ کوئی مونس دل تھا نہ کوئی دشمن جاں
پہلے پہلے تو طبیعت مری گھبرائی بہت

کیٹس کی قبر پہ پہنچا تو بھر آئی آنکھیں
اس جواں مرگ سے جیسے تھی شناسائی بہت

نشہ اترا تو بدن یوں تھا شکستہ جیسے
بادہ پیمائی تھی کم باد یہ پیمائی بہت

اب تو رشک آتا ہے یاروں کی جوان مرگی پر
زندگی میں بھی کبھی تھا تیرا شیدائی بہت

روم کا حسن بہت دامن دل کھینچتا ہے
اے مری خاک پشاور تری یاد آئی بہت

اول عشق کی بات اور بھی جو بھی ہوتا
اب تو ملیے کہ نہ ملنے میں ہے رسوائی بہت

اب فراز اپنے مسیحا سے بھی امید نہ رکھ
وہ تنگ دل ہے تیرے زخم میں گہرائی بہت

◆◆◆

جو قربتوں کے نشے تھے

جو قربتوں کے نشے تھے وہ اب اترنے لگے
ہوا چلی ہے تو جھونکے اداس کرنے لگے

گئی رتوں کا تعلق بھی جان لیوا تھا
بہت سے پھول نئے موسموں میں مرنے لگے

وہ مدتوں کی جدائی کے بعد ہم سے ملا
تو اس طرح سے کہ اب ہم گریز کرنے لگے

غزل میں جیسے ترے خدو خال بول اٹھیں
کہ جس طرح تری تصویر بات کرنے لگے

بہت دنوں سے وہ گھمبیر خامشی ہے فراز
کہ لوگ اپنے خیالوں سے آپ ڈرنے لگے

◆◆◆

انہیں خوش گمانیوں میں

انہیں خوش گمانیوں میں کہیں جاں سے بھی نہ جاؤ
وہ جو چارہ گر نہیں ہے اسے زخم کیوں دکھاؤ

یہ اداسیوں کے موسم یونہی رائیگاں نہ جائیں
کسی یاد کو پکارو کسی درد کو جگاؤ

وہ کہانیاں ادھوری جو نہ ہو سکیں گی پوری
انہیں میں بھی کیوں سناؤں انہیں تم بھی کیوں سناؤ

یہ جدائیوں کے رستے بڑی دور تک گئے ہیں
جو گیا وہ پھر نہ آیا مری بات مان جاؤ

کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فراز کب تک
جو تمہیں بھلا چکا ہے اسے تم بھی بھول جاؤ

طعنہ زن کیوں ہے

طعنہ زن کیوں ہے مری بے سروسانی پر
اک نظر ڈال ذرا شہر کی ویرانی پر

واعظوں میں نے بھی انساں کی عبادت کی ہے
پر کوئی نقش نہیں ہے مری پیشانی پر

ان کے ملبوس میں پیوند مرے جسم کے ہیں
اور یاروں کی نظر ہے مری عریانی پر

وقت رکتا ہی نہیں خواب ٹھیرتے ہی نہیں
پاؤں جمتے ہی نہیں بہتے ہوئے پانی پر

کشتیِ جاں ہے کہ ڈوبے چلی جاتی ہے فراز
اور ابھی درد کا دریا نہیں طغیانی پر

اہلِ تاشقند کے نام

کانسی کے مجسمے میں کیا کیا
اظہار ہے کرب ہے نمو ہے
انسان کے عزم کی علامت
فطرت کے ستم کے روبرو ہے
ہاتھوں میں غضب کا حوصلہ ہے
ماتھوں پہ جلال آبرو ہے
آنکھوں میں وقار فاتحانہ
چہروں پہ گلاب سا لہو ہے
ہر بار بلا کا رن پڑا تھا
ہر بار حیات سرخرو ہے
جیسے کہ مجسمے میں میں ہوں
جیسے کہ مجسمے میں تو ہے

◆◆◆

خود آپ اپنی نظر میں

خود آپ اپنی نظر میں حقیر میں بھی نہ تھا
اس اعتبار سے اس کا اسیر میں بھی نہ تھا

بنا بنا کے بہت اس نے جی سے باتیں کیں
میں جانتا تھا مگر حرف گیر میں بھی نہ تھا

نبھا رہا ہے یہی وصف دوستی شاید
وہ بے مثال نہ تھا بے نظیر میں بھی نہ تھا

سفر طویل سہی گفتگو مزے کی رہی
وہ خوش مزاج اگر تھا تو میں بھی نہ تھا

میں برگ آخر شہر خزاں تھا تھا خاک ہوا
کھلا کہ موسم گل کا سفیر میں بھی نہ تھا

میں کہہ رہا ہوں رفیقوں سے جی کڑا رکھو
چلا جو درد کا اک اور تیر میں بھی نہ تھا

ستم کے عہد میں چپ چاپ جی رہا ہوں فراز
سو دوسروں کی طرح با ضمیر میں بھی نہ تھا

یوں تو محروم نوا کب سے

یوں تو محروم نوا کب سے دہن میرا تھا
پھر بھی چرچا ہوا جس کا وہ سخن میرا تھا

میں نے کس نشہ نخوت میں کمان کھینچی تھی
تیر جس جسم میں اترا وہ بدن میرا تھا

تو کبھی غور سے دیکھ اپنی قبائے ریشم
تیرے خلعت میں کوئی تار کفن میرا تھا

اب تو مجھ کو بھی ندامت ہے وفا پر اپنی
مختلف کتنا زمانے سے چلن میرا تھا

آخری شام خزاں ٹوٹ کے یاد آتی ہے
پھر نشیمن ہی مرا تھا نہ چمن میرا تھا

میری آنکھوں نے جو دیکھا میرے لب پر آیا
میری تقصیر ہی بے ساختہ پن میرا تھا

تھی افق تابہ افق یوں تو مری خاک فراز
کس قدر تنگ مگر مجھ پہ وطن میرا تھا

ہوا کے زور سے پندار بام و در بھی گیا

ہوا کے زور سے پندار بام و در بھی گیا
چراغ کو جو بچاتے تھے ان کا گھر بھی گیا

پکارتے رہے محفوظ کشتیوں والے
میں ڈوبتا ہوا دریا کے پار اتر بھی گیا

اب احتیاط کی دیوار کیا اٹھاتے ہو
جو چور دل میں چھپا تھا وہ کام کر بھی گیا

میں چپ رہا کہ اسی میں تھی عافیت جاں کی
کوئی تو میری طرح تھا جو دار پر بھی گیا

سلگتے سوچتے ویران موسموں کی طرح
کڑا تھا عہد جوانی مگر گزر بھی گیا

جسے بھلا نہ سکا اس کو یاد کیا رکھتا
جو نام لب پہ رہا ذہن سے اتر بھی گیا

پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے یوں نہ دیکھ مجھے
تجھے تلاش ہے جس شخص کی وہ مر بھی گیا

مگر فلک کی عداوت اسی کے گھر سے تھی
جہاں فراز نہ تھا سیل غم ادھر بھی گیا

ہر دوا درد کو بڑھا

ہر دوا درد کو بڑھا ہی دے
اب تو اے دل اسے بھلا ہی دے

لٹنے والے سے یوں گریز نہ کر
کیا خبر وہ تجھے دعا ہی دے

جس کے چہرے پہ میری آنکھیں ہیں
وہ مجھے طعن کم نگاہی دے

یہ بھی اک شیوہ رفاقت ہے
جانے والوں کو راستا ہی دے

جانکنی کے عذاب سے نکلوں
آخری تیر بھی چلا ہی دے

اب تو جیسے فراز باد مراد
زندگی کا دیا بجھا ہی دے

کہا نہیں تھا

کہا تھا
اس شہر کو نہ جاؤ
اب اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے
تو رو رہے ہو
کہ اب وہاں تم نہیں
نئے لوگ بس گئے ہیں
کہا تھا
اب شہر آرزو
دشت جاں رہا ہے
گئے زمانوں کی خوشبوئیں میں کب سے مرچکی ہیں
جدائیاں کام کر چکی ہیں
تمہارے نغموں کے نرم پودے
نئی رتوں کی شدید لو سے جھلس گئے ہیں
گلاب کے سرخ سرخ پھولوں کو
کاسنی سانپ ڈس گئے ہیں
وہ گفتگوؤں کی آبجو میں
سکوت کے ریگزار میں دفن ہوگئی ہیں
وہ عہد و پیماں کی فاختائیں
افق کے اس پار کھو گئی ہیں
کہا تھا۔۔۔۔وہ ساعتیں نہ لوٹیں گی
جو گئی ہیں

□

کہا تھا
تم قرب کے نشے میں
انا کے مینار چن رہے ہو
کہا تھا
تم اس وفا کے صحرا میں
اپنی آواز سن رہے ہو
ڈراؤنے خواب بن رہے ہیں
تمہیں بڑا زعم تھا
کہ آنکھوں کے آئینوں کو
ہر انجمن کو سجا رہے تھے
تمہیں غرور اپنی ذات پر تھا
کہ اپنا سب کچھ لٹا رہے تھے
کہا تھا
ان آئینوں کو اب دیکھنے نہ جاؤ
کہ ان میں اوروں کے عکس ہوں گے
کہا تھا
ان راستوں پہ اب تم نہ گنگناؤ
کہ دوسرے محو رقص ہوں گے
یہ آئینے
جو ہر ایک دیوار پر سجے ہیں
تمہارے اشکوں کی کانچ ہے بس
یہ برف کے پیکروں کے شعلے
تمہارے سانسوں کی آنچ ہے بس
فراق کی بات ہی جدا ہے

یہاں تو آنکھوں سے آئینوں سے
جو عکس اوجھل ہوا
تو پر وہ کہیں نہیں تھا
پلٹ کے آئے تو کیا
نہ آئے تو کیا
کہ آنکھیں تو آئینے ہیں
اور آئینوں کو غرض نہیں ہے
کہ کون چہرہ نظر نشیں تھا
وہ کوئی پتھر تھا یا نگیں تھا
کہا نہیں تھا۔

قامت کو تیرے سرو صنوبر

قامت کو تیرے سرو صنوبر نہیں کہا
جیسا بھی تو تھا اس سے تو بڑھ کر نہیں کہا

اس سے ملے تو زعم تکلم کے باوجود
جو سوچ کر گئے وہی اکثر نہیں کہا

اتنی مروتیں تو کہاں دشمنوں میں تھیں
یاروں نے جو کہا مرے منہ پر نہیں کہا

مجھ سا گنہگار سر دار کہہ گیا
واعظ نے جو سخن سر منبر نہیں کہا

برہم بس اس خطا پہ امیران شہر ہیں
ان جوہڑوں کو میں نے سمندر نہیں کہا

یہ لوگ میری فرد عمل دیکھتے ہیں کیوں
میں نے فراز خود کو پیمبر نہیں کہا

◆◆◆

اتنا بے رنگ دکھ کو

اتنا بے رنگ دکھ کو نہیں جانیے، ہر رگِ جاں شعاع بند ہوئے گی
لوگ پھر سے اچھالیں گے اپنا لہو اور گلگوں قبائے وطن ہوئے گی

تا کجے یونہی اختر شماری کرو، جوئے خوں اپنی رگ رگ سے جاری کرو
اور کچھ روز سینہ فگاری کرو، بزم خاموش، بزم سخن ہوئے گی

تم نے تو ہونٹوں پہ مہریں لگا دیں تو کیا، تم نے شمعیں نوا کی بجھا دیں تو کیا
جو حکایت سنی ان سنی ہوگئی اب وہی انجمن انجمن ہوئے گی

اب تلاشِ مسیحا عبث دوستو جو قاتل ہے بس جستجو اس کی ہو
ورنہ نامِ خدا نا سزا ہوئے گا، اور خلقِ خدا بے کفن ہوئے گی

رت کو آخر بدلنا ہے دوستو، اس قیامت کو ٹلنا تو ہے دوستو
اس طرف ہم کو چلنا تو ہے دوستو، جس طرف فصلِ دار و رسن ہوئے گی

میں ترا قاتل ہوں

میں ترا قاتل ہوں
اے مشرق مجھے مصلوب کر
میں جو عیسا کے لبادے
میں ترے بیمار فرزندوں کے گھر
آیا تھا
کل چارہ گری کے واسطے
میں نے ان سے کیا کیا
میں کہ درماں بن کے آیا تھا
ترے ناسور زخموں کے لئے
بارود کا مرہم لئے
بندوق کا پرچم لئے
میرے بوجھل بوٹ
جن کی چاپ
تیرے چوبداروں سی تھی
اب کے بار ایسے زلزلے لائے
کہ تیرے ہنستے بستے شہر ملبے بن گئے
(اور درودیوار کے ڈھیروں میں
کرلاتا ہوا
گونگے مکینوں کا لہو)
خاک وخوں کے اس گلابے سے
میں اپنے بھاری بوٹوں کو نکالوں کس طرح

یہ مری بندوق میرے دوش پر اک بوجھ ہے
اور زمیں مجھ کو نگلتی جا رہی ہے دم بدم
میرے مشرق
جانکنی کے اس مسلسل کرب سے
مجھ کو بچا میرے لہو میں ڈوب کر
میں ترا قاتل
تر عیسا
مجھے مصلوب کر

◆◆◆

جو سر بھی کشیدہ ہوا

جو سر بھی کشیدہ ہوا اسے دار کرے ہے
اغیار تو کرتے تھے سو اب یار کرے ہے

وہ کون ستمگر تھے کہ یاد آنے لگے ہیں
تو کیسا مسیحا ہے کہ بیمار کرے ہے

اب روشنی ہوتی ہے کہ گھر جلتا ہے دیکھیں
شعلہ سا طواف و درو و دیوار کرے ہے

کیا دل کا بھروسہ ہے یہ سنبھلے کہ نہ سنبھلے
کیوں خود کو پریشاں مرا غم خوار کرے ہے

ہے ترک تعلق ہی مداوائے غم جاں
پر ترک تعلق تو بہت خوار کرے ہے

اس شہر میں ہو جنبش لب کا کسے یارا
یاں جنبش مژگاں بھی گنہگار کرے ہے

تو لاکھ فراز اپنی شکستوں کو چھپائے
یہ چپ تو ترے کرب کا اظہار کرے ہے

کشیدہ سر سے توقع

کشیدہ سر سے توقع عبث جھکاؤ کی تھی
بگڑ گیا ہوں کہ صورت یہی بناؤ کی تھی

وہ جس گھمنڈ سے بچھڑا گلہ تو اس کا ہے
کہ ساری بات محبت میں رکھ رکھاؤ کی تھی

وہ مجھ سے پیار نہ کرتا تو وار کیا کرتا
کہ دشمنی میں بھی شدت اسی لگاؤ کی تھی

مگر یہ دور طلب بھی سراب ہی نکلا
وفا کی لہر بھی جذبات کے بہاؤ کی تھی

اکیلے پار اتر کر یہ نا خدا نے کہا
مسافرو یہی قسمت شکستہ ناؤ کی تھی

چراغ جاں کو کہاں تک بچا کے ہم رکھتے
ہوا بھی تیز تھی، منزل بھی چل چلاؤ کی تھی

میں زندگی سے نبرد آزما رہا ہوں فراز
میں جانتا تھا یہی راہ اک بچاؤ کی تھی

ہر کوئی جاتی ہوئی رت

ہر کوئی جاتی ہوئی رت کا اشارہ جانے
گل نہ جانے بھی تو کیا باغ تو سارا جانے

کس کو بتلائیں کہ آشوب محبت کیا ہے
جس پہ گزری ہو وہی حال ہمارا جانے

جان نکلی کسی بسمل کی نہ سورج نکلا
بجھ گیا کیوں شب ہجراں کا ستارا جانے

جو بھی ملتا ہے ہمیں سے وہ گلہ کرتا ہے
کوئی تو صورت حالات خدارا جانے

دوست! احباب تو رہ رہ کے گلے ملتے ہیں
کس نے خنجر مرے سینے میں اتارا جانے

تجھ سے بڑھ کر کوئی ناداں نہیں ہوگا کہ فراز
دشمن جاں کو بھی تو جان سے پیارا جانے

میں اکیلا کھڑا ہوں

پیمبر!
تری بارگاہ معلّیٰ میں
عصیاں کے انبار سے سرنگوں
اک گنہگار انساں کھڑا ہے
نہ اس کے بدن پر عبا دقبا ہے
نہ ہاتھوں میں تسبیح کا سلسلہ ہے
نہ ماتھے پہ محراب داغ ریا ہے
یہ وہ بدمقدر ہے
جس کا بدن بارش سنگ خلقت سے
غربال ہے
جس کی گردن میں طوق ملامت پڑا ہے
یہ زندہ گڑا ہے
یہ مجرم ہے
ان دائمی اور سفاک سچائیوں کا
کہ جو تو نے کاذب جہان کو عطا کیں
یہ مجرم ہے
ان بے غرض جراتوں کا
جو تو نے ہر اک ناتواں کو عطا کیں
یہ کہتا ہے
اے دائمی حکمتوں کے پیمبر
کہ انسان سب برابر ہیں
ان میں کوئی کم نسب کوئی برتر نہیں ہے
یہ کہتا ہے

الفاظ سب سے مقدس ہیں
اور حرف کی روشنی سے
کوئی نور بڑھ کر نہیں ہے
یہ سرکش
مقدر کو انساں کا راہوار کہتا ہے
آدم کو نقاش ہستی کا شہکار کہتا ہے
کیا کچھ یہ ظالم گنہ گار کہتا ہے
اے روشنی کے پیمبر

یہ شوریدہ سر
حرف زن ہے
کہ محراب منبر سے
فتویٰ گر وفتنہ پرداز دیں
حرف حق بیچتے ہیں
فقیہان مسند نشیں
حرص و دینار و درہم میں
تیرے صحیفے کا اک اک ورق بیچتے ہیں
یہ خلقت کا خوں
اور اپنی جبیں کا عرق بیچتے ہیں
پیمبر
مجھے حوصلہ دے
کہ میں ظلم کی قوتوں سے
اکیلا لڑا ہوں
کہ میں اس جہاں کے جہنم کدے میں
اکیلا کھڑا ہوں

□

سلام اس پر!

حسینؑ!
اے میرے سر بریدہ
بدن دریدہ
سدا ترا نام برگزیدہ ف
میں کربلا کے لہولہو دشت میں تجھے
دشمنوں کے نرغے میں
تیغ در دست دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں
کہ تیرے سارے رفیق سب ہمنوا
سبھی جانفروش
اپنے سروں کی فصلیں کٹا چکے ہیں
گلاب سے جسم اپنے خوں میں نہا چکے ہیں
ہوائے جانکاہ کے بگولے
چراغ سے تابناک چہرے بجھا چکے ہیں
مسافران رہ وفا لٹ لٹا چکے ہیں
اور اب فقط تو
زمین کے اس شفق کدے میں
ستارہ صبح کی طرح
روشنی کا پرچم لئے کھڑا ہے
یہ ایک منظر نہیں ہے
اک داستاں کا حصہ نہیں ہے

اک واقعہ نہیں ہے
یہیں سے تاریخ
اپنے تازہ سفر کا آغاز کر رہی ہے
یہیں سے انسانیت
نئی رفعتوں کو پرواز کر رہی ہے
میں آج اسی کربلا میں
بے آبرو۔۔۔نگوں سر
شکست خوردہ خجل کھڑا ہوں
جہاں سے میرا عظیم ہادی
حسین کل سرخرو گیا ہے
میں جاں بچا کر
فنا کے دلدل میں جاں بلب ہوں
زمین اور آسمان کی عز و فخر
سارے حرام مجھ پر
وہ جان لٹا کر
منارہ عرش چھو گیا ہے
سلام اس پر
سلام اس پر

گلیوں میں کیسا شور تھا

گلیوں میں کیسا شور تھا کیوں بھیڑ سی مقتل میں تھی
کیا وصف اس شاعر میں تھا کیا بات اس پاگل میں تھی

ایسا ستم کیا ہوگیا کہ راہرو تھا کھوگیا
پھر زندگی کی شام تھی اور شام بھی جنگل میں تھی

کیا کیا ہوا چلتی رہی، یہ لو مگر جلتی رہی
کیا زور اس آندھی میں تھا کیا تب اس مشعل میں تھی

شعلہ بہ دل آتش بجاں پھرتا رہا وہ بے اماں
ورنہ صبا زلفوں میں تھی ورنہ گھٹا کاجل میں تھی

ترسی ہوئی آنکھوں میں کن کن ساحلوں کے خواب تھے
پر کشتی عمر رواں حالات کی دلدل میں تھی

خلقت نے آوازے کسے طعنے دیئے فتوے جڑے
وہ سخت جاں ہنستا رہا گو خود کشی پل پل میں تھی

اپنی کشید جاں سے ہی پیتا رہا جیتا رہا
نشہ کہاں ساغر میں تھا مستی کہاں بوتل میں تھی